مدرّسینِ قرآن کے لیے خصوصی ہدایات

قرآن وحدیث کی روشنی میں

حافظ محمد زبیر

پچھلی دو تین دہائیوں سے فہم قرآن کی جو تحریک پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں بالعموم اور شہر لاہور میں بالخصوص جس تیزی سے پھیل رہی ہے وہ واقعتاً ایک بہت ہی مستحسن امر ہے' اور یہ کہنے میں بھی کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اس تحریک نے ایک بہت بڑے تعلیم یافتہ طبقے کو متأثر کیا ہے اور ہزاروں افراد کی زندگیوں کے رُخ کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ یہ اسی درسِ قرآن اور ترجمۂ قرآن کی کلاسز کے ہی ثمرات ہیں کہ آج ہر طرف فہم قرآن کے ادارے نظر آتے ہیں اور قرآن کے درس وتدریس کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ہم فہم قرآن کی اس تحریک کے حق میں ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' لیکن چونکہ اس تحریک کے اکثر افراد نہ تو دینی مدارس کے فارغ طلبہ یا علماء ہیں اور نہ ہی انہوں نے ٹھوس علمی بنیادوں پر دین یعنی قرآن وحدیث کا باقاعدہ علم حاصل کیا ہوتا ہے' اس لیے اپنی کم علمی کی وجہ سے یہ حضرات بعض اوقات لاشعوری طور پر درسِ قرآن کے اصل مقصد سے ہٹ کر ایک ایسی راہ پر چلنا شروع کر دیتے ہیں جس سے خیر کم وجود میں آتا ہے اور فتنہ پیدا ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ایسے مدرسین' اپنے خلوص کے باوصف' معاشرے کی اصلاح کی بجائے اس میں عدم توازن اور باہمی منافرت کا ایک سبب بن جاتے ہیں۔ اس مضمون میں ہمارے پیش نظر قرآن وحدیث کی روشنی میں مدرسین قرآن کی ان کوتاہیوں کی نشاندہی ہے جو عام طور پر معاشرے میں اصلاح کی بجائے خرابی کا باعث بنتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ مضمون ایک مدرسِ قرآن کو ایک منہج بھی فراہم کرتا ہے جس پر چل کر وہ اپنے دروس کو عوام الناس کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکتا ہے۔ اس مضمون سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم دروسِ قرآن کے عوامی حلقوں کے خلاف ہیں' بلکہ ان گزارشات سے ہمارا مقصود مدرسینِ قرآن کو صرف یہ حقیقت

باور کرانا ہے کہ ان کی اصل حیثیت مصلحین کی ہے نہ کہ مفسرین کی' اور حلقہ ہائے درسِ قرآنی کا اصل ہدف انذار و تبشیر اور تذکیر ہے نہ کہ تفسیر و تاویل۔ اس ضمن میں قرآن و حدیث پر مبنی چند ہدایات درج ذیل ہیں:

۱) اخلاص

دین اسلام میں ''نیت'' کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) (۱)

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''

اللہ کے رسول ﷺ کی اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اعمال کی جزا و سزا میں نیت کا عمل دخل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بظاہر ایک عمل لوگوں کے ہاں بہت بڑی نیکی کا کام ہوتا ہے لیکن اللہ کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی' بلکہ بعض اوقات یہ عامل کے لیے عذاب کا باعث بھی بن جاتا ہے' کیونکہ اس میں اخلاص نہیں ہوتا۔ مدرسین کو چاہیے کہ سب سے پہلے اپنے اندر اخلاص پیدا کریں' خالصتاً اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے درسِ قرآن دیں۔ بعض اچھے مدرسین کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہ اپنے دروس میں لوگوں کی تعداد کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں' اگر کسی جگہ لوگوں کی تعداد کم ہو تو وہاں درس دینے سے یا تو انکار کر دیتے ہیں یا اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا اخلاص کے منافی ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ ایک جگہ ایک بڑے مجمع سے خطاب کے لیے تشریف لے گئے' تقریباً دو گھنٹے توحید پر درس دیا۔ جب آپ کا درس ختم ہو چکا تو تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا شخص وہاں پہنچا۔ حضرت شاہ صاحب نے جب اس بوڑھے سے وہاں آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے حضرت شاہ صاحب کو بتایا کہ وہ ان کا درس سننے کے لیے آیا تھا۔ حضرت شاہ صاحب اس بوڑھے شخص کے جذبے اور ولولے کو دیکھ کر مکمل درس اس اکیلے بوڑھے کو دوبارہ سنانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس پر وہ بوڑھا حضرت شاہ صاحب سے پوچھنے لگا کیا آپ مجھ اکیلے کے لیے دوبارہ اتنا طویل درس دیں گے؟ تو شاہ صاحب نے اس کو جو جواب دیا وہ واقعتاً سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے فرمایا:

''پہلے بھی ایک (اللہ تعالیٰ) ہی کو راضی کرنے کے لیے درس دیا تھا اور اب بھی ایک ہی کو راضی کرنا مقصود ہے''۔

جب انسان کے سامنے اصل مقصود اللہ کی رضا ہو تو پھر اس بات کی اہمیت بہت کم رہ جاتی ہے

کہ آپ کا درس سننے کے لیے کتنے افراد تشریف لاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کامیاب مدرس اس کو شمار کیا جاتا ہے جس کے درس میں لوگوں کی تعداد زیادہ ہو' جبکہ اللہ کے ہاں کامیاب مدرس وہ ہے جس میں اخلاص زیادہ ہو' چاہے اس کے درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے مدرسین کو چاہیے کہ وہ شیطان کے وسوسے میں آ کر حاضرین کی تعداد کو اپنے درس کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار نہ بنائیں' بلکہ اپنا اصل مقصود اللہ کی رضا کو بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے کہ وہ آپ کے اخلاص کی بنیاد پر دیے گئے درس میں شریک فردِ واحد سے ہی دین کی کوئی اتنی بڑی خدمت لے لے جو کہ عدم اخلاص کی بنیاد پر دیے گئے درس میں شریک ہزاروں سامعین کے مجموعی عمل سے کئی گنا زیادہ ہو۔

۲) اِنذار اور فتویٰ کا فرق

بعض مدرسین کے حوالے یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ وہ اپنے دروس میں قرآنی آیات کو جب مختلف افراد' اسلامی جماعتوں اور مسلمان معاشروں پر چسپاں کرتے ہیں تو اُن کا اسلوب ناصحانہ کی بجائے مفتیانہ ہوتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض مدرسین نفاق' شرک اور کفر سے متعلقہ آیات کا درس دیتے ہوئے بڑی دیدہ دلیری سے عام مسلمانوں پر ان آیات کا انطباق کرنا شروع کر دیتے ہیں اور نتیجتاً مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو منافق' کافر' مشرک اور جہنمی بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ایک مدرس اپنے درس کے لیے نفاق سے متعلقہ آیات کا انتخاب کرتا ہے' پھر اُن آیات کا عام مسلمانوں پر انطباق کرتا ہے' اور آخر میں آیت مبارکہ ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ سنا کر اپنے تئیں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو جہنمی اور اس آیت مبارکہ کا مصداق بنا دیتا ہے۔ یہ طرزِ عمل قرآن کے اس مقصد کے بھی خلاف ہے جس کی خاطر اس کو نازل کیا گیا ہے۔ قرآن اس لیے نہیں آیا کہ ہم لوگوں پر فتوے لگا کر خوش ہوں کہ تم جہنمی ہو' منافق ہو' مشرک ہو' کافر ہو وغیرہ' بلکہ قرآن تو اس لیے آیا ہے کہ ہم لوگوں کو نفاق' شرک اور کفر سے نکال کر جنتی بنائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تبشیر (جنت کی بشارت) کے ساتھ ساتھ انذار (آخرت کا خوف دلانا) بھی مطلوب ہے' لیکن انذار اور فتویٰ میں بہت فرق ہے۔ انذار یہ ہے کہ آپ لوگوں کو خبردار کریں' انہیں بتائیں کہ یہ منافقین کی صفات ہیں' یہ اعمال مشرکانہ یا کافرانہ ہیں' قرآن نے ان چیزوں سے روکا ہے اور ان کے مرتکبین کو جہنم کی وعید سنائی ہے۔ یہ تو انذار کا انداز ہے۔ جب کہ فتویٰ کا اسلوب یہ ہے کہ آپ کہیں جو یہ کام کرے گا وہ کافر ہے' مشرک ہے' جہنمی ہے' ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے

گا۔قرآنی آیات کا مخصوص مسلمانوں اور مسلمان معاشروں پر انطباق کرنا شرعی اصطلاحات کے مطابق اجتہاد ہی کی ایک قسم ہے اور یہ کام فقہاء اور مفتیانِ کرام کا ہے' مدرسین کا نہیں۔عربی زبان کے چند بنیادی قواعد کو سیکھ لینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی درجۂ اجتہاد اور مسند افتاء پر فائز ہو گیا ہے اور اس کے پاس یہ سند آ گئی ہے کہ لوگوں پر قرآنی نصوص کا انطباق کرتا پھرے' بلکہ مدرسین کو چاہیے کہ اپنے دروس میں عوام الناس کو منافق اور جہنمی قرار دینے کی بجائے انہیں ایک باعمل مؤمن اور جنتی بنانے کی طرف توجہ دیں۔

ایک خاتون نے راقم الحروف کو بتایا کہ وہ لاہور کے ایک معروف دینی ادارے میں سمر کورس کرنے کے لیے تشریف لے گئیں تو پہلے ہی دن معلّمہ نے ایمان و اسلام کے تقاضوں پر درس دینے کے بعد تمام خواتین سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔تو وہاں پر موجود سب خواتین نے معلّمہ کے درسِ قرآن سے متأثر ہو کر اس بات کا اقرار کیا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔مذکورہ خاتون نے مزید بتایا کہ اگلے دن جب وہ کلاس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئیں تو انہوں نے کلاس میں موجود خواتین کو سلام نہ کیا۔اس پر کلاس میں موجود تمام خواتین نے ان سے اس بات پر احتجاج کیا کہ آپ نے کلاس میں داخل ہوتے وقت سلام کیوں نہیں کیا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ صرف مسلمانوں کو سلام کرنا چاہیے جبکہ کل پوری کلاس نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔کچھ ہی دیر بعد معلّمہ صاحبہ کلاس میں تشریف لے آئیں اور انہوں نے آتے ہی پوری کلاس سے سوال کیا کہ کیا آپ کے اندر ایمان ہے؟ تو ساری کلاس کا سر شرم کے مارے جھک گیا۔پھر معلّمہ صاحبہ نے کہا تمہیں کیا معلوم کہ ایمان کیا ہوتا ہے! آج میں تمہیں بتاؤں گی کہ ایمان کیا ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں!

یہ تو صرف ایک واقعہ ہے' اس قسم کے بیسیوں دروس میں باقاعدہ سامعین سے اس بات کا اقرار یا کم از کم یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ منافق ہیں اور ایمان سے خالی ہیں۔ہمارے خیال میں یہ طرزِ عمل اس حکمت کے بھی منافی ہے جس کے بارے میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ دعوت و تبلیغ میں اس کو ملحوظ رکھیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۵)

''(اے نبیؐ!) اللہ کے راستے کی طرف بلائیے حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے

ساتھ اور اُن سے مجادلہ کیجیے اس طریقے پر جو کہ بہتر ہو۔''

۳) تفسیر بالمأثور کا التزام

تفسیر کی دو قسمیں ہیں: تفسیر بالمأثور اور تفسیر بالرائے۔ تفسیر کی پہلی قسم ''تفسیر بالمأثور'' کے جواز کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے' جبکہ دوسری قسم ''تفسیر بالرائے'' کے جائز ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال اور تفاصیل ہیں۔

تفسیر بالمأثور کو ''تفسیر بالروایہ'' یا ''تفسیر بالمنقول'' بھی کہتے ہیں۔ اس کی مزید چار قسمیں ہیں:

۱) قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنا
۲) قرآن کی تفسیر حدیث سے کرنا
۳) قرآن کی تفسیر اقوالِ صحابہؓ سے کرنا
۴) قرآن کی تفسیر اقوالِ تابعینؒ سے کرنا

اللہ کے رسول ﷺ جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کے الفاظ سکھاتے تھے اسی طرح قرآن کے معانی بھی بتاتے تھے' کیونکہ یہ آپؐ کی ذمہ داری تھی کہ صحابہؓ کو قرآن کے الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی بھی بتائیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ٤٤)

''اور ہم نے (اے نبیؐ!) آپ کی طرف الذکر (قرآن) کو نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لیے ان کی طرف نازل کردہ چیز (قرآن مجید) کے معانی واضح کر دیں''۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآنی الفاظ کے معانی کی بھی تعلیم دی۔ مشہور تابعی ابوعبدالرحمٰن السلمی کا قول ہے:

حدثنا الذين يقرء ون القرآن كعثمان بن عفان و عبد الله بن مسعود وغيرهم أنهم كانوا اذا تعلموا من النبي ﷺ عشر آيات لم يتجاوزها حتى يعلموا ما فيها من العلم و العمل(۲)

''جن صحابہؓ نے ہمیں قرآن پڑھایا' مثلاً حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ ابن مسعود وغیرہ' وہ ہم سے کہتے تھے کہ جب وہ اللہ کے نبی ﷺ سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتے تو اُس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے جب تک ان دس آیات کا مکمل علم وعمل حاصل نہ کر لیتے تھے''۔

اس قسم کے اور بھی بہت سارے آثار مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن کی تفسیر خود بیان کی ہے۔ ہمارے ہاں مدرسین میں حدیث کا فہم اور مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے عموماً یہ کوتاہی پائی جاتی ہے کہ وہ بعض اوقات آیاتِ قرآنیہ کی ایسی تفسیر کر جاتے ہیں جو احادیثِ رسول ﷺ کے صریحاً خلاف ہوتی ہے۔

ایک مدرسِ قرآن جو ماشاء اللہ بہت نیک طبع اور باعمل تحریکی کارکن ہیں' انہوں نے جب ایک آیت مبارکہ کی تفسیر اپنی ذاتی رائے سے بیان کی تو راقم الحروف نے ان کو متنبہ کیا کہ ان کی یہ تفسیر صحیح حدیث کے خلاف ہے۔ مزید برآں جب اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں بخاری شریف کی ایک حدیث اُن صاحب کو پیش کی گئی اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی کہ جلیل القدر ائمہ مفسرین مثلاً ابن کثیر وغیرہ نے بھی اس آیت مبارکہ کی تفسیر اسی حدیث سے کی ہے اور جو تفسیر بالرائے آپ بیان کر رہے ہیں وہ آج تک کسی مفسر نے نہیں بیان کی تو اُن کا مجھے یہ جواب موصول ہوا کہ ائمۂ سلف کی تفسیر بیان کرنے کی بجائے خود بھی اس آیت مبارکہ پر غور کر لیجیے۔ قابل تعجب بات یہ ہے کہ عربی زبان کی واجبی سی شد بد حاصل کرنے کے بعد مدرسین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ امام ابن کثیر' علامہ قرطبی اور ابن جریر طبری جیسے جلیل القدر مفسرین کی صف میں' بلکہ شاید اُن سے بھی کچھ آگے کھڑے ہیں۔ یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ علم حدیث سے ناواقفیت کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ کی تفسیر سے ہٹ کر تفسیر بالرائے کرتے ہیں اور اس پر مصر بھی ہوتے ہیں۔ جان لیجیے کہ یہ اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ جو تفسیر بھی حدیث کے خلاف ہوگی وہ مردود اور قابل مذمت ہے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی فرماتے ہیں:

> ''تفسیر میں اصل گمراہی کا سبب اس بنیادی حقیقت کو بھول جانا ہے کہ قرآن کے مطالب وہی ہیں جو اس کے مخاطبِ اوّل (یعنی محمد ﷺ) نے سمجھے اور سمجھائے ہیں۔ قرآن محمد ﷺ پر نازل ہوا اور قرآن بس وہی ہے جو محمد ﷺ نے سمجھا اور سمجھایا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے' یا تو علمی' روحانی نکتے ہیں' جو قلبِ مؤمن پر القاء ہوں اور یا پھر اقوال و آراء ہیں' انکل پچو باتیں ہیں' جن کے محتمل قرآنی لفظ کبھی ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے' لیکن یہ یقینی بات ہے کہ وہ باتیں قرآن سے مقصود نہیں ہیں۔ قرآنی مقصود صرف وہی ہے جو رسول ﷺ نے سمجھا اور سمجھایا ہے۔ دوسری کسی بات کو مقصودِ قرآنی کہنا ظلم و زیادتی ہے اور افتراء علی اللہ''۔ (۳)

لہٰذا مدرسین کو چاہیے کہ درسِ قرآن دیتے ہوئے حدیث اور اقوالِ صحابہؓ کا خصوصی اہتمام

کریں۔ اصل تفسیر ''تفسیر بالماثور'' ہی ہے۔ تفسیر کی اس قسم میں احتیاط ملحوظ رکھنا اس قدر ضروری ہے کہ تفسیر سے متعلقہ احادیث' اقوالِ صحابہ اور اقوال تابعین کو بیان کرتے وقت صحیح سند سے ثابت شدہ احادیث اور اقوال کا التزام کیا جائے۔ تفسیر بالماثور پر مشتمل معروف تفاسیر میں تفسیر طبری' تفسیر ابن کثیر اور مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب کی تیسیر القرآن کا مطالعہ مدرسین کو لازماً کرنا چاہیے' کیونکہ یہ تفاسیر ایک مدرس بلکہ مفسر کے لیے بھی ایک حد قائم کر دیتی ہیں کہ یہ وہ حدود ہیں جن سے قرآن کے درس اور تفسیر میں تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

۴) تفسیر بالرائے سے اجتناب

اس کو ''تفسیر الدرایہ'' اور ''تفسیر بالمعقول'' بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد قرآن کی تفسیر خود قرآن' یا حدیث' یا اقوال صحابہ یا اقوالِ تابعین سے کرنے کی بجائے اپنے اجتہاد اور رائے کی بنیاد پر کرنا ہے۔ تفسیر بالرائے کی دو قسمیں ہیں: تفسیر بالرائے محمود اور تفسیر بالرائے مذموم۔

تفسیر بالرائے محمود: درج ذیل اوصافِ ثلاثہ پر مشتمل تفسیر' تفسیر بالرائے محمود کہلاتی ہے:

۱) جو تفسیر سلف صالحین کے عقیدے' منہج تفسیر اور اصولِ تفسیر کے مطابق ہو۔

۲) تفسیر بالماثور کے مخالف نہ ہو اور قواعد لغویہ عربیہ کے موافق ہو۔

۳) جس کے مفسر میں تفسیر کی تمام علمی' اخلاقی' دینی' عقلی اور عملی شرائط پائی جاتی ہوں۔

تفسیر بالرائے مذموم: اگر کسی تفسیر میں درج ذیل اوصاف میں سے کوئی ایک وصف بھی پایا جائے تو وہ تفسیر بالرائے مذموم ہے:

۱) جو سلف صالحین کے عقیدے' منہج تفسیر یا اصولِ تفسیر کے خلاف ہو۔

۲) تفسیر بالماثور یا قواعد لغویہ عربیہ کے خلاف ہو۔

۳) جس کا مفسر جاہل ہو یا ان تفسیری علوم سے ناواقف ہو کہ جن کا علم ایک مفسر کے لیے از بس ضروری ہے' مثلاً علمِ حدیث' علمِ لغت' علمِ نحو' علمِ صرف' علمِ اشتقاق' علمِ بلاغت' علمِ اصولِ فقہ' علمِ قراءت' علمِ ناسخ و منسوخ' علمِ اسبابِ نزول' علمِ اصول الدین (یعنی عقائد)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ تفسیر بالرائے جائز ہے' لیکن اس کے باوجود صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ اپنے تقویٰ و ورع کی بنیاد پر تفسیر بالرائے سے

حتی الامکان گریز کرتے تھے اور ممکن حد تک تفسیر بالماثور پر ہی اکتفا کرتے تھے' جیسا کہ درج ذیل آثار سے واضح ہوتا ہے۔

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

۱) حضرت ابو معمر الأزدیؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے قرآن کی آیت ﴿وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا﴾ کے بارے میں سوال ہوا تو جواب میں آپؓ کہنے لگے:

أیّ أرض تقلنی و أیّ سماء تظلنی اذا قلتُ فی القرآن برأیی(۴)

''کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر میں قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کروں؟''

۲) حضرت ابن ابی ملیکہؒ سے روایت ہے کہ:

أنّ ابن عباس سئل عن آیة لوسئل عنها بعضکم لقال فیها' فابی أن یقول فیها(۵)

''حضرت ابن عباسؓ سے قرآن کی ایک آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے اس آیت کی تفسیر سے اجتناب کیا۔ اگر تم میں سے کسی سے اس آیت کے مفہوم کے بارے میں سوال کیا جاتا تو وہ ضرور اس کا مفہوم بتا دیتا''۔

۳) حضرت طلق بن حبیبؒ سے روایت ہے کہ وہ حضرت جندبؓ کے پاس آئے اور ان سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی' حضرت جندبؓ نے جواب دیا:

''میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ اگر تم مسلمان ہو تو میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ یا یہ کہا کہ میرے پاس مت بیٹھو''۔

۴) حضرت یزید بن ابی یزیدؒ سے روایت ہے کہ:

کنا نسأل سعید بن المسیب عن الحلال و الحرام' و کان اعلم الناس' فاذا سالناه عن تفسیر آیة من القرآن سکت کان لم یسمع(۷)

''ہم حضرت سعید بن مسیبؒ سے حلال و حرام کے بارے میں سوال کرتے تھے' کیونکہ انہیں اس چیز کا سب سے زیادہ علم تھا' لیکن جب ہم ان سے قرآن کی کسی آیت کی تفسیر پوچھتے تو وہ ایسے خاموش ہو جاتے تھے جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو''۔

۵) علامہ ابن سیرینؒ سے روایت ہے کہ میں نے عبیدہ السلمانیؒ سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے کہا:

ذهب الذين كانوا يعلمون القرآن فيم أنزل القرآن ' اتق الله و عليك بالسداد (۸)

''وہ لوگ چلے گئے جو یہ جانتے تھے کہ قرآن کس بارے میں نازل ہوا۔تمہارے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ سے ڈرو اور سیدھی راہ پر چلتے رہو''۔

۶) علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ کہتے تھے:

''ہمارے اساتذہ تفسیر کرنے سے بچتے اور ڈرتے تھے''۔(۹)

۷) مسروقؒ کہا کرتے تھے:

''تفسیر کرنے سے بچو اور ڈرو' کیونکہ تفسیر اللہ کی طرف سے روایت ہے''۔(۱۰)

مذکورہ بالا آثار سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین پر قرآن کی کسی آیت کی تفسیر کرتے وقت کس قدر اللہ کا خوف اور ڈر غالب ہوتا تھا باوجود یکہ وہ اس کے سب سے زیادہ اہل بھی تھے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ:

۱) تفسیر بالرائے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے۔

۲) اگر تفسیر بالرائے کرنی ہی ہو تو ایسا شخص کرے جو صحیح معنوں میں اس کا اہل ہو اور ان شرائط کے مطابق کرے جو کہ تفسیر بالرائے محمود کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکی ہیں۔

۳) علاوہ ازیں یہ کہ تفسیر بالرائے کرنے کے بعد بھی اس کو اپنی رائے ہی کے طور پر بیان کرے اور اللہ کی طرف اس کی نسبت کرنے سے ڈرتا رہے۔

۴) ہمارے ہاں مدرسین چونکہ تفسیر بالرائے کی مذکورہ بالا شرائط پر پورے نہیں اُترتے لہٰذا ان کے لیے درسِ قرآن دیتے وقت قرآنی آیات کا مسلم معاشروں پر انطباق کرنا یا ان سے نئی نئی تفاسیر اختراع کرنا بالکل بھی جائز نہیں ہے۔ مدرسین کو چاہیے کہ اپنے دروس میں اوّل تو تفسیر بالماثور پر ہی اکتفا کریں' لیکن اگر تفسیر بالرائے کے ضمن میں کچھ بیان کرنا بھی ہے تو صرف معروف معاصر مفسرین کے حوالے سے ہی کچھ بیان کر دیں اور اپنی الگ رائے ہرگز پیش نہ کریں!

۵) قرآن کتاب ہدایت ہے

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن میں ہمیں مختلف علوم کا تذکرہ ملتا ہے' لیکن یہ بات یقینی ہے کہ قرآن نہ تو سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی فلسفے کی' بلکہ یہ کتاب ہدایت ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو اور ان کی آئندہ آنے والی ذرّیت کو جنت سے اتار کر اس دنیا میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تو اللہ کی طرف سے یہ فرمان جاری ہوا:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرۃ)

''ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ' پس جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو بھی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا تو انہیں نہ تو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (البقرۃ)

''یہ کتاب' اس میں کوئی شک نہیں ہے' یہ ہدایت ہے متقین کے لیے''۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''یہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا' یہ پوری نوع انسانی کے لیے ہدایت ہے اور ہدایت کے واضح دلائل پر مشتمل ہے''۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''پرانے وقتوں میں یونانی فلسفے' ایرانی اوہام اور ہندی تصوف کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ موجودہ زمانے میں یورپ کی ذہنی غلامی نے عقلوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور یورپ کی خرافات کو بھی حقائق سمجھ لیا گیا ہے۔ کتاب اللہ کو توڑ مروڑ کر یورپین نظریوں پر منطبق کرنے کا ایک جنون پھیلا ہوا ہے۔ کوئی ڈارون کی تھیوری قرآن سے ثابت کرتا ہے اور کوئی آئن سٹائن کے نظریے کو قرآن پر چسپاں کرتا ہے۔ حالانکہ کتاب اللہ کا مقام اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ اسے انسانی تخیلات کا تابع بنایا جائے۔ کتاب اللہ نہ عقلیات کی کتاب ہے اور نہ سائنس میں دخل دیتی ہے' وہ تو انسانی ہدایت کے لیے آئی ہے' اور اس سے کھیلنا نہیں بلکہ ہدایت حاصل کرنا چاہیے تھا۔ قرآن عقل سلیم کے عین مطابق ہے' لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ علمائے یورپ کے جملہ نظریات و اوہام کی کسوٹی پر بھی پورا اترے!''(۱۱)

۶) قرآن کی عملی تفسیر

ایک اور چیز جس کو عام طور پر مدرسینِ قرآن نظر انداز کر دیتے ہیں' وہ قرآن کی علمی اور عملی تفسیر کا فرق ہے۔ نظم و مفردات کی دقیق اور فصاحت و بلاغت کی لطیف بحثیں تفسیر قرآن کا تو موضوع ہو سکتی ہیں لیکن انہیں درس قرآن کا موضوع بنانا دعوت و تبلیغ کی حکمت کے منافی ہے۔ اس لیے کہ یہ ساری بحثیں سامعین کو محض وقتی لطف و تسکین ہی فراہم کر سکتی ہیں۔ جہاں تک انذار' تبشیر اور تذکیر کا معاملہ ہے' تو ایسی بحثوں سے بالعموم ان مقاصد کے حصول کی بجائے ان کے برعکس نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ درس قرآن کا اصل مقصد لوگوں کو قرآن پر عمل کرنے کے لیے ترغیب و تشویق دلانا ہو نہ کہ قرآن کے علمی' اعجازی اور بلاغی پہلوؤں کی وضاحت کرنا۔

راقم الحروف نے پہلی مرتبہ جب رمضان کے مہینے میں نماز تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن کی کلاس کا آغاز کیا تو شروع شروع میں اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر ترجمۂ قرآن کے درمیان اکثر و بیشتر وقت نظم قرآن کی پیچیدہ بحثوں کو سلجھانے میں لگ جاتا تھا' جو ایک طرف تو عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر تھیں اور دوسری طرف حقیقت یہ تھی کہ ان ابحاث کا کوئی تعلق سامعین کے عمل سے نہ تھا۔ دوسری بار جب راقم الحروف نے رمضان کے دوران ترجمہ قرآن کی کلاس میں نظم قرآن اور اشتقاقاتِ قرآن کی بحثوں کی بجائے سامعین کو ایسی احادیث' اقوال صحابہ اور تاریخی واقعات سنائے جن کا تعلق عملی پہلو سے تھا تو لوگوں نے بھی پہلے کی نسبت زیادہ اثر لیا۔ جب تیسری بار رمضان میں ترجمۂ قرآن کرایا تو آیت ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝﴾ (الزُّخرف) کے ذیل میں سواری پر سوار ہونے کی دعا اور طریقہ بتلایا تو درس کے بعد ایک بزرگ نے اس بات کی طرف میری توجہ دلائی کہ '' پچھلی دفعہ آپ نے اس آیت کی تشریح میں فلاں حدیث بیان کرتے ہوئے سواری پر سوار ہونے کا جو طریقہ بتایا تھا وہ اس سے قدرے مختلف ہے جو آپ نے آج بتایا ہے''۔ دیکھئے ان صاحب نے اس حدیث کو یاد رکھا حالانکہ خود مجھے وہ حدیث بھول چکی تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ حدیث عمل سے متعلق تھی لہٰذا اس کو سننے کے بعد وہ اپنے عمل میں بھی لے آئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ نظمِ قرآن اور فصاحت و بلاغت کی علمی ابحاث طالبانِ قرآن کے لیے تعلیم و تعلم کے مراحل میں تو مفید ثابت ہو سکتی ہیں' جبکہ وعظ و نصیحت کے حلقوں میں اس قسم کے علمی نکات سے سامعین کی اصلاح تو نہیں ہوتی البتہ مدرسین کا علمی رعب ضرور قائم ہو جاتا

ہے۔ ویسے بھی ترجمہ قرآن اور درسِ قرآن کی مختصر دورانیہ کی مجالس میں اس قسم کی پیچیدہ بحثوں میں الجھنا اس لیے بھی کوئی مستحسن امر نہیں ہے کہ کم ہی مدرسین ایسے ہوتے ہیں جو ایسی بحثوں کو چھیڑ کر ان کا حق ادا کر سکیں۔

۷) ابلاغ کے ساتھ اصلاح بھی

ہمارے ہاں دروسِ قرآن میں اصلاح سے زیادہ ابلاغ پر زور ہوتا ہے اور ہر درس کے آخر میں بغیر سوچے سمجھے ہم یہ آیت بھی تلاوت کر دیتے ہیں:

﴿وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ﴾ (یٰسٓ)

''اور نہیں ہے ہماری ذمہ داری مگر واضح طور پر پہنچا دینا''۔

لیکن ہم حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول کو بھول جاتے ہیں جو انہوں نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

﴿اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ﴾ (ھود:۸۸)

''میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں جس قدر میں کر سکتا ہوں''۔

داعی اور مدعو کا اصل رشتہ صرف ابلاغ کا نہیں ہے' بلکہ ''ابلاغ مع الاصلاح'' کا ہے۔ مدرسین کو چاہیے کہ اپنے دروس کو ابلاغ کے ساتھ ساتھ مخاطبین کی اصلاح کا بھی ذریعہ بنائیں۔ درس قرآن کے ذریعے ہم لوگوں کی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں' اس کو ایک زندہ مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سمیہ رمضان ایک مُدرِّسہ ہیں جو کہ اپنے ہفتہ وار درسِ قرآن میں ہر ہفتے ایک آیت کا انتخاب کرتی ہیں اور درسِ قرآن کے شرکاء کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس ہفتے دن رات اس آیت کے معانی پر غور کرتے ہوئے اس کا وِرد کریں۔ ایسے ہی ایک درس میں محترمہ سمیہ رمضان نے قرآن کی درج ذیل آیت ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ (التغابن) کا انتخاب کیا اور درس کے تمام شرکاء کو یہ ہدایت کی کہ وہ اس آیت کا اس ہفتے توجہ کے ساتھ مسلسل وِرد جاری رکھیں۔ ایک خاتون جو کہ درس میں شریک ہوتی تھیں' گھر میں بہت زیادہ چیختی چلاتی تھیں۔ اس آیت کا وِرد ان کی اصلاح کا کس طرح ذریعہ بنا' یہ انہی کی زبانی ہم سنتے ہیں:

''جیسا کہ درس میں محترمہ سمیہ نے راہنمائی کی تھی' میں یہ آیت بار بار دہراتی رہی حتیٰ کہ مجھے حفظ ہو گئی۔ یوں ایک دن گزر گیا۔ اگلے دن کی صبح حسب معمول بچے اسکول جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ اس مرحلے پر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میری حالت

انتہائی قابل رحم ہوتی ہے۔ایک ہی وقت میں ہر کوئی اپنی اپنی چیز مانگ رہا ہوتا ہے۔ مجھے اس موقع پر چلانے کی عادت تھی' میں بچوں کے ساتھ چیخ چیخ کر باتیں کرتی تھی' مگر اس صبح میں نے آیت کریمہ ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۱۹﴾﴾ پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔اس آیت کے نفاذ کے حقیقی ٹسٹ کے وقت' بچوں کے رویے کی وجہ سے میرے رویے میں بھی شدت آنے لگی۔ میرے مزاج میں آج پھر تیزی آنے لگی' کیوں کہ ایک بچے کو جوتا نہیں مل رہا تھا' دوسرے کو بیلٹ' تیسرے کو پین اور چوتھے کو بستہ۔ یہ سن کر میری کیفیت وہی ہوگئی جو پہلے ہوتی تھی۔ میں نے بچوں کو زور زور سے ڈانٹنا شروع کر دیا۔مگر اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ سرخ ہوگیا ہے اور میری شکل گدھے کی سی ہو رہی ہے' کان گدھے کی طرح لمبے ہو رہے ہیں۔ میں نے فوراً سوچا کہ گدھے کی طرح آواز نکالنے سے تو ہمیں روکا گیا ہے۔ہمیں اپنی آواز گدھے سے مشابہ نہیں کرنی چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے جب روک دیا ہے' اپنا حکم دے دیا ہے تو پھر ہمیں اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔کہیں ہماری شکل بگڑ نہ جائے' ہم یہودیوں کی طرح خنزیروں اور بندروں کی صورت میں مسخ نہ کر دیے جائیں! میں چیخنے چلانے کی اس تشبیہ کا تصور کر کے شرمندہ ہوئی' کیوں کہ اس طرح میں انسانوں سے نکل کر حیوانوں کے زمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ تصور آتے ہی میں بچوں کے لیے نرم پڑ گئی اور آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ ''ہاں یہ لے لو' یہ تمہارا جوتا ہے' قلم بھی یہیں کہیں ہوگا' تم نے اپنی ضروری چیزیں کل ہی اپنے بستے میں کیوں نہ رکھ لیں''۔ یوں یہ مشکل ترین مرحلہ آسانی سے گزر گیا۔ان چند منٹوں میں میرا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ جایا کرتا تھا اور مجھے اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی' لیکن اس دن یہ لمحے سکون و قرار سے گزر گئے''۔(۱۲)

اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم ہر ہفتے ایک آیت کا انتخاب کر کے اپنی اور سامعین کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ﴿۳۴﴾﴾ کے ورد سے عہد کی پابندی' سورۂ مریم کی آیت ﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾﴾ کے ورد سے نماز کی پابندی اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾﴾ کے ورد سے اپنے آپ کو اور اپنے درس کے شرکاء کو نماز فجر کی جماعت کے ساتھ ادائیگی پر آمادہ کر سکتے ہیں۔اسی طرح غیبت'

بہتان، تمسخر اور سوئے ظن جیسی معاشرتی برائیوں سے بھی سورۃ الحجرات کی آیات کو موضوع درس بنانے سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سورۃ المؤمنون کی شروع کی آیات اور سورۃ الفرقان کی آخری آیات کو بھی اپنی اصلاح کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے اور سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف کی منتخب آیات کے مذاکرے اور ورد سے باطل نظام کے خلاف جذبات کو مہمیز دینے اور اللہ کی رضا کی خاطر تن من دھن لگانے کے دواعی پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کا بہتر اور مفید طریقہ یہی ہے کہ ایک ہفتے کے لیے صرف ایک ہی آیت یا حکم کا انتخاب کر کے اس کے کثرتِ ذکر سے اس آیت کو اس کے مفہوم سمیت حرزِ جان بنایا جائے۔

۸) درس قرآن کا معیار

درس قرآن کے حوالے سے جو کوتاہیاں پائی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں درس قرآن کے لیے مدرس کا کوئی معیار مقرر نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں ایک مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم عربی زبان کے بنیادی قواعد اور اسالیب سے واقف ہو اور اس کی تجوید اس قدر درست ہو کہ قرآن پڑھتے وقت لحن جلی کا مرتکب نہ ہو۔ ایک مدرس اگر قرآن کی تلاوت بھی صحیح طرح نہ کر سکتا ہو تو اس کو درس قرآن کی اجازت دینا قرآن کے ساتھ ظلم ہے۔ ایسے مدرسین جو کہ درس قرآن کے کم از کم معیار پر بھی پورے نہ اترتے ہوں، انہیں چاہیے کہ یا تو وہ درسِ قرآن کی بجائے انفرادی دعوت و تبلیغ کے میدان کا انتخاب کریں یا پھر کسی مستند عالم دین کے ترجمہ و تفسیر قرآن کی مجالس قائم کریں۔ فہم قرآن کی مختلف تحریکوں اور جماعتوں کے منتظمین کو بھی چاہیے کہ وہ علماء کی زیر نگرانی مدرسین کے لیے مختلف قسم کی تربیتی ورکشاپوں کا بھی وقتاً فوقتاً انعقاد کرتے رہیں۔

حواشی

۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب بدء الوحی۔

۲) الاتقان فی علوم القرآن، امام سیوطی، جلد ۲، ص ۱۷۶۔

۳) مقدمة اصول تفسیر از علامہ ابن تیمیہ، ترجمة مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی، ص ۸۔

٤) تفسیر طبری، امام ابن جریر طبری، جلد ۱، ص ۷۸، دار المعارف مصر۔

۵، ٦، ۷، ۸) تفسیر طبری، امام ابن جریر طبری، جلد ۱، ص ۸٦، دار المعارف مصر۔

۹، ۱۰، ۱۱) مقدمہ اصول تفسیر از علامہ ابن تیمیہ، ترجمہ مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی، ص ٦۹۔

۱۲) قرآن پر عمل، سمیہ رمضان، ص ۴۰، ۴۱۔ منشورات، منصورہ لاہور۔